رمضان میں انسان خدا کی مشابہت میں قریب تر ہو جاتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ خود اس کی جزا بن جاتا ہے۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ 4 / مارچ 1994ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور انور نے فرمایا:۔

آج اللہ کے فضل کے ساتھ رمضان مبارک اپنے آخری عشرے میں داخل ہو چکا ہے اگر چہ سنت کے مطابق اعتکاف کرنے والے ایک دن پہلے سے اعتکاف بیٹھ چکے ہیں لیکن دراصل اعتکاف آخری عشرے کا اعتکاف ہوتا ہے اور چونکہ آخری عشرہ کی تعیین کرنا ممکن نہیں تھا۔ ممکن تھا کہ بجائے تیس کے انتیس کا رمضان ہو جاتا اس لئے حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کی سنت ہمیشہ سے یہی رہی کہ احتیاطاً ایک دن پہلے اعتکاف بیٹھتے تھے اور اعتکاف کب شروع کیا؟ کیسے ہوا؟ اور کب تک اعتکاف بیٹھتے رہے؟ اس مضمون سے متعلق میں سمجھتا ہوں جماعت کو کچھ واقفیت کروانی چاہئے۔

علماء تو اکثر جانتے ہیں لیکن نئی نسلوں کے بچے، بعد میں آ کر شامل ہونے والے ان باتوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔ یہ تو پتا ہے کہ اعتکاف مسجد میں بیٹھا جاتا ہے لیکن اس سے متعلق دیگر باتوں کا علم نہیں اور خصوصاً سنت کی تفصیل سے بے خبری ہے اور جب تک ہم سنت کی روشنی میں اعتکاف کو نہ سمجھیں اس وقت تک اس سے حقیقی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

اعتکاف کا پسِ منظر یہ ہے کہ جب سے دنیا بنی ہے اور عبادت فرض ہوئی ہے اعتکاف کا تصور عبادت کے ساتھ ملحق رہا ہے اور کبھی بھی اسے جدا نہیں کیا گیا چنانچہ پہلا گھر جو خدا کے لئے بنایا

گیا اس کے مقاصد میں بھی اعتکاف کو داخل فرمایا گیا اور معتکفین کی خاطر بھی مسجد کو پاک اور صاف رکھنے کی تلقین فرمائی گئی۔ اسی طرح دنیا کے تمام مذاہب میں آغاز ہی سے اعتکاف کا تصور ملتا ہے میں نے جہاں تک موازنۂ مذاہب سے متعلق کتب کا مطالعہ کیا ہے مجھے ایک بھی ایسا مذہب معلوم نہیں ہوا جس میں اعتکاف کا تصور موجود نہ ہو لیکن اسلام تک پہنچتے پہنچتے یہ تصور زیادہ پختہ ہو گیا تھا اور زیادہ بالغ بن چکا تھا۔ کیا فرق پیدا ہوا ہے؟ یہ میں آپ کو بعد میں سنت کے حوالے سے بتاؤں گا۔ لیکن عموماً اعتکاف کہتے ہیں خدا کی یاد میں ایک طرف ہو رہنا اور دنیا سے ظاہری قطع تعلق کر کے جس حد تک ممکن ہے انسان اپنے آپ کو یادِ الٰہی میں وقف کر دے۔

بعض مذاہب میں اس اعتکاف میں غلو کیا گیا یہاں تک کہ زندگی بھر دنیا سے تعلق کاٹ کر الگ رہنے کا نام ہی اعتکاف سمجھا گیا اور بہت سے راہب اور اسی طرح ہندو سادھو وغیرہ جو دنیا سے قطع تعلق کر کے بعض دفعہ پہاڑوں کی کھوہوں میں جا بیٹھتے ہیں اور کلیۃً دنیا سے بیگانہ ہو جاتے ہیں یہ اعتکاف ہی کی بگڑی ہوئی صورت ہے جو اعتکاف میں مبالغے کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے۔ قرآن کریم نے عمر بھر کے لئے دنیا سے قطع تعلق کو ناپسند ہی نہیں فرمایا بلکہ واضح طور پر اس کی مناہی موجود ہے اور یہ فرمایا گیا ہے کہ عیسائیوں میں بھی جو رہبانیت کا رواج پایا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے آغاز میں اس صورت میں یہ رہبانیت ان پر فرض نہیں فرمائی تھی بلکہ بعد میں ان لوگوں نے اس مضمون کو بگاڑ کر اسے عمر بھر کی دنیا سے قطع تعلق پر منتج کر دیا اور ایک اچھی پر حکمت تعلیم کو بظاہر نیکی کی خاطر، مگر بگاڑ دیا اور ایسا بنا دیا کہ ہر انسان کے بس میں وہ بات نہ رہی۔

قرآن کریم ایک عالمگیر تعلیم ہے اور قرآن کریم کا تعلق خانہ کعبہ کے تمام مقاصد سے بہت گہرا ہے اور قرآن کریم کا طریق یہ ہے کہ ان تمام نیکیوں کو ان کی اصل صورت پر بحال کیا جائے جس صورت میں وہ آغاز میں فرض ہوئی تھیں۔ نیکیوں کی وہ صورت بحال کی جائے جو اللہ تعالیٰ بندوں سے چاہتا ہے اور اس ضمن میں حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کی سنت سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ہم نیکیوں کی ماہیت کو سمجھ سکیں۔

آنحضرت ﷺ کی ساری زندگی اس بات کا نمونہ تھی کہ خدا سے تعلق قائم کرنا دنیا سے کلیۃً تعلق کاٹنے کو نہیں کہتے بلکہ اسے فرار کہا جاتا ہے۔ اگر انسان دنیا سے کلیۃً جدا ہو جائے اور اس کی

کشش اور جذب سے اتنا دور ہٹ جائے کہ اس کی آزمائش کا سوال ہی باقی نہ رہے تو اسے خدا پرستی نہیں کہا جاتا، اسے دنیا کے خوف سے اس سے بھاگنا قرار دیا جا سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی ساری زندگی جو قطع تعلقی کے نمونے ہمیں دکھاتی رہی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر اس سے الگ رہنا اور اس سے مرعوب نہ ہونا اور اس سے مغلوب نہ ہو جانا۔ اسی کا نام جہاد ہے تمام زندگی انسان ایسے جہاد میں مصروف رہے کہ ہر طرف سے چاروں طرف سے اسے آزمائشیں بار بار مبتلا کریں اور ٹھوکر لگانے کی کوشش کریں لیکن انسان صراطِ مستقیم پر مضبوط قدموں کے ساتھ گامزن رہے اور کسی دوسری آواز کی طرف متوجہ نہ ہو۔ یہ دراصل اللہ کے لئے دنیا سے الگ ہو جانا ہے جو سنت حضرت محمد مصطفی ﷺ سے ثابت ہوتا ہے اور قرآن کریم کی تمام تعلیم اسی مرکزی نقطے کے گرد گھومتی ہے اسی کا نام صراطِ مستقیم ہے۔ اسی کا نام حدِّ اوسط ہے۔ اسی کو لَا عِوَجَ لَهٗ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ گویا کہ اپنی راہ پر جو وسطی راہ ہے، نہ افراط کی راہ ہے نہ تفریط کی راہ ہے، نہ حد سے زیادہ آگے بڑھا جا رہا ہے، نہ فرائض کی ادائیگی میں کوئی کمی کی جا رہی ہے، اس متوازن رستے پر رہتے ہوئے اپنی زندگی گزارو اور ثابت قدم رہو۔ یہی مضمون اعتکاف کا مضمون ہے۔ اعتکاف بھی دنیا سے کچھ دیر کے لئے اس طرح الگ ہونے کا نام ہے کہ بظاہر انسان کلیۃً کٹ گیا ہو اور آزمائش سے نکل گیا ہو۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس مضمون پر بھی حیرت انگیز روشنی ڈالی ہے اور اسے قربانی قرار دیا ہے۔ آزمائش سے الگ ہو جانے کو آنحضور ﷺ نے نیکی کا اعلیٰ درجہ نہیں بلکہ قربانی قرار فرمایا ہے۔

پہلے تو میں آپ کو مختصراً یہ بتاؤں کہ آنحضورؐ کا اعتکاف کیسے تھا۔ کس طرح شروع ہوا۔ سب سے پہلے تو رمضان مبارک کے ساتھ ہی رسول اکرم ﷺ نے جو اعتکاف شروع کیا وہ وسط رمضان میں ہوا کرتا تھا یعنی رمضان کے دوسرے عشرے کے آغاز سے شروع ہوتا تھا اور آخر تک جاری رہتا تھا۔ لیکن آنحضرت ﷺ اعتکاف کو سورج ڈوبنے کے بعد اگلا دن شروع ہونے کے وقت ختم نہیں فرمایا کرتے تھے بلکہ آخری رات کو بھی بیچ میں شامل فرما لیتے تھے اور اکیس کی صبح کو اپنا اعتکاف ختم کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ یہی طریق جاری رہا اور حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کے ساتھ معیت کے شوق میں کئی صحابہؓ نے آپؐ کے ساتھ مسجد میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ بلکہ امہات المومنین میں سے بھی

بعض نے وہاں اپنے خیمے لگا لئے۔ایک موقع پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق آتا ہے کہ آپ نے اپنا خیمہ آنحضورؐ کی اجازت سے مسجد کے صحن میں گاڑ لیا۔ جب دوسری ازواج کو پتا چلا تو دیکھا دیکھی اس شوق میں کہ یہ کیوں آگے بڑھ گئی ہم بھی ساتھ شامل ہوں خود حضرت عائشہؓ سے سفارش کروا کر پہلے اجازت لی پھر آہستہ آہستہ اور خیمے بھی لگنے شروع ہو گئے جس کی براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت نہیں لی گئی بلکہ حضرت عائشہ ہی سے اجازت لے کر کہ چلیں ہم بھی گاڑ لیں۔آپؓ نے فرمایا ہاں تم بھی لگا لو چنانچہ وہ خیمے لگ گئے۔آنحضرت ﷺ جب تشریف لائے اور مسجد میں خیمے دیکھے تو آپؐ نے فرمایا یہ کیا ہو رہا ہے، یہ کیسے خیمے لگے ہوئے ہیں؟ تو بتایا گیا کہ یہ امہات المومنین کے خیمے ہیں۔آپؐ کی ازواج کے خیمے ہیں۔آپؐ نے فرمایا ان کے ہاں نیکی کا یہ تصور ہے؟ اس کو نیکی کہتے ہیں؟ ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔یعنی نیکی ایک طبعی خود رَو خواہش کے نتیجے میں تو پیدا ہوتی ہے مگر نقالی کے نتیجے میں نہیں ہوتی اور اتنا اس بات کو ناپسند فرمایا کہ اس رمضان مبارک میں اعتکاف نہیں فرمایا اور اس سال کا اعتکاف کا ناغہ شوال میں پورا کیا (ابن ماجہ کتاب الصیام حدیث: 1761)۔آپؐ نے فرمایا اس حالت میں مَیں اس مسجد میں نہیں بیٹھوں گا اور یہ بھی آنحضرت ﷺ کی سیرت کی ایک عجیب شان ہے۔ان بیویوں کو فرما سکتے تھے کہ تم یہاں سے نکل جاؤ، خیمے اٹھا لو۔کیوں نہیں کہا؟ اس لئے کہ مسجد میں اعتکاف کا عورت کا حق تسلیم فرما چکے تھے اور یہ حق حضرت عائشہؓ کی صورت میں تسلیم ہو چکا تھا تو باقی بیویوں کی صورت میں کیا عذر تھا کہ ان سے کہا جاتا کہ نہیں، تمہیں اجازت نہیں ہے۔لیکن چونکہ یہ محسوس فرمایا کہ اس میں نیکی کی خواہش سے زیادہ بیویوں کے آپس کے مقابلے کا رجحان زیادہ دکھائی دے رہا ہے۔اس لئے آپؐ نے فرمایا کہ یہ نیکی نہیں رہی کہ اس طرح اگر نقالی کرتے ہوئے نیکی اختیار کی جائے جس میں آپس کی رقابت کارفرما ہو تو فرمایا یہ نیکی نہیں رہتی اور اس پر ایک ہی فیصلہ آپؐ فرما سکتے تھے کہ اچھا ان کو تو نہیں ہٹا سکتا یہاں سے، میں خود ہٹ جاتا ہوں۔ پس یہ عجیب ہے کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت، اتنی گہرائی ہے اس سیرت میں کہ انسان ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے، کیسا پاکیزہ تعلق تھا اپنی ازواج سے۔ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو ڈانٹ ڈپٹ کر اور غصے کے طور پر نہیں بلکہ ایک ایسے عجیب انداز سے کہ اس سے حقوق پر بھی کوئی ضرب نہیں پڑتی اور جو تکلیف اٹھائی وہ خود اٹھائی۔لیکن اعتکاف

کا ناغہ نہیں فرمایا چنانچہ شوال کے ایام میں آپؐ اعتکاف بیٹھے۔

بیچ کے دنوں کا اعتکاف آخری عشرے کے اعتکاف میں کیسے تبدیل ہوا؟ ایک دفعہ صبح کے وقت حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے وہ رات دیکھی ہے۔ یعنی لیلۃ القدر مراد تھی اور وہ دیکھی ہے اکیس کی صبح کے تعلق میں۔ جبکہ اعتکاف ختم ہو چکے تھے۔ آپؐ نے فرمایا اس کی مجھے علامتیں بھی دکھائی گئی ہیں۔ بارش ہو رہی ہے اور چھت ٹپک رہی ہے اور میں سجدہ کرتا ہوں تو میرے ماتھے پر گیلی مٹی لگ جاتی ہے اور پانی بھی مجھ پر پڑا ہوا ہے۔ یہ فرمانے کے بعد فرمایا کہ میں پوری طرح یاد نہیں رکھ سکا کہ بعینہٖ وہ کون سی رات ہے مگر یہ نظارہ میں نے اکیس کی رات کو دیکھا ہے۔ اس لئے آئندہ سے میں آخری عشرے میں اعتکاف بیٹھا کروں گا۔ پس جن لوگوں نے میرے ساتھ اعتکاف بیٹھنے کی سعادت پائی ہے (یعنی لفظ سعادت وہاں تو استعمال نہیں فرمایا تھا میں کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ سعادت پائی ہے) وہ میرے ساتھ اسی رمضان میں اس عشرے میں بھی بیٹھیں۔ تو اس آخری عشرے میں بھی آنحضور ﷺ اعتکاف میں بیٹھے اور وہ سال ایسا تھا کہ دو اعتکاف اکٹھے ہو گئے۔ ایک وسطی عشرے کا ایک آخری عشرے کا اور راوی بیان کرتے ہیں کہ اسی رات بارش بھی ہوئی اور ہم نے خود آنحضرت ﷺ کی پیشانی پہ وہ مٹی لگی ہوئی دیکھی ہے۔ وہ چھت ٹپکی ہے اور خاص طور پر اس رؤیا کی صداقت کے اظہار کے طور پر وہاں ٹپکی کہ جہاں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سجدہ فرمایا کرتے تھے اور پھر ہم نے دیکھا کہ آپؐ بھیگ چکے تھے اور ماتھے پر وہ گیلی مٹی لگی ہوئی تھی۔ یہ روایت بخاری کتاب الاعتکاف سے لی گئی ہے اور اس کے راوی ہیں سعید الخدریؓ جو بہت مشہور اور ثقہ راوی ہیں۔ (بخاری کتاب الاعتکاف حدیث نمبر: 1895)

پس اس دن سے یہ سنت پختہ ہو گئی اور اس پر آنحضرت ﷺ پھر تمام زندگی قائم رہے کہ رمضان مبارک کے آخری عشرے میں اعتکاف بیٹھا کرتے تھے اور دیگر اصحاب جن کو توفیق ملتی اور مسجد میں ان کے لئے جگہ ملتی ان کو بھی اجازت تھی کہ وہ ساتھ بیٹھیں۔

آنحضور ﷺ عام طور پر اس جگہ اعتکاف بیٹھتے تھے کہ جہاں آپؐ کے گھر کی طرف اندرون خانہ ایک کھڑکی مسجد میں بھی کھلتی تھی اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے کہ بعض دفعہ سر میں تیل لگانا ہو اور کنگھی کرنی ہو تو آپؐ کھڑکی سے سر باہر کر دیا کرتے تھے یعنی گھر کی طرف اور میں

وہیں سے آپؐ کے سر پہ تیل لگا کر کنگھی کر دیا کرتی تھی۔ (بخاری کتاب الاعتکاف حدیث: 1888)

اور حدیث کو اپنے اصل مسلک سے ہٹا کر فقہاء میں یہاں تک بحثیں راہ پا گئی ہیں کہ مسجد میں بیٹھ کر حجامت بنوانا جائز ہے کہ نہیں ہے اور فتویٰ دینے والوں نے فتویٰ یہی دیا کہ جائز ہے۔ اور حوالہ اس حدیث کا دیتے ہیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ جب میں نے جماعتِ احمدیہ کی فقہ میں دیکھا جو ہمارے ملک سیف الرحمٰن صاحب مرحوم کی تحریر کردہ ہے تو وہاں بھی یہی لکھا ہوا تھا۔ باقاعدہ بحث اٹھائی گئی تھی کہ سوال ہے کہ مسجد میں اعتکاف کے دنوں میں بیٹھ کر سر منڈوانا، حجامت کروانا جائز ہے یا نہیں۔ تو جواب یہ ہے کہ جائز تو ہے مگر مکروہ ہے اور مکروہ ہونے کے لحاظ سے حضرت امام مالک کا حوالہ دیا گیا ہے کہ انہوں نے اس بات کو ناپسند فرمایا۔ اس کو ناجائز اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ رسول اکرم ﷺ نے مسجد میں ہوتے ہوئے اعتکاف کی حالت میں سر کھڑکی سے باہر کیا اور وہاں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ کے سر پہ تیل بھی لگایا اور کنگھی بھی کی۔ اب اس سے یہ ثابت ہو جانا تو حیرت انگیز بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ بعض باتیں ایسی ہیں جن کا فتاوٰی سے تعلق نہیں ہوتا۔ سیدھی سادھی عقل سے تعلق ہوتا ہے۔ مسجد میں حجام آنے شروع ہو جائیں اور وہاں کپڑے بچھائے جائیں اور ان پر حجامتیں ہو رہی ہوں، ایسا بھیانک تصور ہے کہ اس پر یہ سوال اٹھانا ہی بے وقوفی ہے کہ یہ جائز ہے کہ ناجائز ہے۔ اب یہ سوال اٹھنے شروع ہو جائیں فقہ میں کہ ایک آدمی اپنی ٹانگوں کے ساتھ رسیاں باندھے، الٹا لٹک جائے، الٹا لٹک کے کھانا کھائے یہ جائز ہے کہ ناجائز ہے۔ تو جواب دیا جائے کہ جائز تو ہے مگر مکروہ ہے۔ جواب یہ ہونا چاہئے کہ تمام اہلِ عقل کیلئے ناجائز ہے اور جو بے وقوف ہیں ان کے لئے ہر چیز جائز ہے پھر مسئلہ کیا پوچھتے ہیں۔ پس جب آپ ان روایات کو یا دیگر روایات کو پڑھتے ہیں۔ وہ روایات جن کا اعتکاف یا عبادتوں سے تعلق ہے وہاں بہت سے ایسے مضمون راہ پا گئے ہیں جن پر تعجب ہوتا ہے کہ یہ سوال اٹھائے کیوں گئے ہیں۔ لیکن اگر آج کل کا کوئی تعلیم یافتہ انسان ان تمام فقہی بحثوں کو پڑھے جن کا ذکر ہمارے فقہاء کی کتب میں ملتا ہے۔ تو انسان حیران رہ جاتا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ بعض متنفر ہو کے دین سے ہٹ جاتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ فقہ ہے مذہب کی۔ جو سب سے اعلیٰ مذہب، سب سے کامل مذہب اور یہ لغو بحثیں اس میں اٹھائی جا رہی ہیں۔ کوّا حلال ہے کہ حرام ہے اگر مکروہ ہے تو اسے طیب بنانے کے لئے کیا طریق

اختیار کرنے چاہئیں۔ کتنے دن بھوکا رکھا جائے کتنے دن صرف پانی پلایا جائے تا کہ اس کا سابقہ گند دور ہو جائے اور اس کا گوشت حلال بن جائے۔ کتابیں لکھی گئی ہیں اس پر۔ ایسی ایسی بحثیں اٹھائی گئی ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ جو کہتے تھے کوّا کھانا جائز ہے وہ کہتے تھے کہ ہم اس کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہیں اور تم دین کو بگاڑ رہے ہو جب کہتے ہو کہ کوّا حرام ہے۔

میں آپ کو یہ اس لئے سمجھا رہا ہوں کہ اعتکاف کے تعلق میں بھی جو روایتیں ملتی ہیں ان کو عقل سے پہچاننا چاہئے۔ یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کی روح کیا ہے؟ روح وہی ہے جو حضرت اقدس محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی اور جس پر عمل کیا کہ کوئی غیر ضروری بات نہیں کرنی۔ نہ مسجد کے اندر نہ مسجد کے باہر۔ مسجد سے باہر نکلنا ہے تو حوائج ضروریہ کی خاطر نکلنا ہے اور وہاں سنگھار پٹار بھی نہیں کرنا اور وہاں وہ زینت بھی نہیں اختیار کرنی جو عام طور پر جائز ہے۔ اس حدیث سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے میں اس کے بالکل برعکس نتیجہ نکال رہا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود صبح اور شام اپنے گھر میں حوائج ضروریہ کے لئے داخل ہوا کرتے تھے۔ وہاں کنگھی اٹھا کر خود بھی کنگھی کر سکتے تھے۔ وہاں خود بھی تیل کی مالش سر پہ فرما سکتے تھے لیکن نہیں کیا کیونکہ اسے بنیادی حوائج ضروریہ میں ایسا نہیں سمجھا (حوائج ضروریہ کا مطلب یہ ہے انتہائی بنیادی ضرورت) کہ اس پر بھی وقت لگایا جائے۔ ورنہ کئی لوگ ایسے ہیں کہ خصوصًا اگر خواتین بھی اعتکاف بیٹھیں تو وہ تو بعض دفعہ آدھا آدھا گھنٹہ اپنے چہرے درست کرنے پر لگا دیتی ہیں۔ تو حضرت اقدس محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو گہری نظر سے پڑھنا چاہئے پھر صحیح سبق ملیں گے۔ پس اس روایت سے مسجد میں دوسری چیزیں نہ کرنے کا ثبوت تو ملتا ہے، کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بالکل برعکس نتیجہ ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتکاف یہ تھا کہ مسجد سے باہر نکلتے تو محض اتنا فرض ادا کرتے جس کا مسجد میں ادا کرنا ممکن نہ ہو اور جہاں مسجد میں بعض چیزیں کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے وہاں سر باہر نکال لیا، اگر کسی کے لئے ایسا موقع ہو کسی کا گھر اس طرح ساتھ جڑا ہو تو اس کو یہ اجازت ہے مگر اس سے زیادہ کی نہیں۔ مگر جہاں تک ضروری امور میں بعض مشوروں کا تعلق ہے وہ مسجد میں رہ کر اعتکاف کی حالت میں بھی ناجائز نہیں ہے۔

حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے کہ ایک موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف بیٹھے ہوئے تھے تو آپ کے خیمے میں گئیں اور وہاں کچھ دیر بعض اہم امور پر آپس میں باتیں

ہوئیں اور یہ بات اعتکاف کی روح کے خلاف نہیں تھی۔ جب آپؓ اٹھنے لگیں تو آپؐ نے فرمایا ٹھہرو میں بھی چلتا ہوں اور اس میں بھی ایک عجیب شان ہے آپؐ کے عظیم اخلاق کی۔ مسجد کو اس وقت اپنا گھر بنا بیٹھے تھے۔ اپنے گھر ایک باہر کا مہمان آیا تھا اس کی عزت افزائی کے لئے مسجد کے دروازے تک چھوڑنے گئے ہیں۔ عجیب شان ہے۔ فرمایا ٹھہرو ٹھہرو، میں بھی چلتا ہوں ساتھ۔ میں تمہیں وہاں تک چھوڑنے جاتا ہوں جہاں تک میں جا سکتا ہوں اور مسجد کے دروازے پر جا کر الوداع کہا۔ یہ وہی موقع ہے جس کے متعلق وہ حسنِ ظن اور بدظنی کے متعلق ایک عجیب روایت ملتی ہے اس وقت دو انصاری اس جگہ سے گزر رہے تھے جہاں مسجد کے دروازے سے وہ اندر دیکھ سکتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ آنحضرت ﷺ کو دیکھا تو سلام کیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ ٹھہرو ٹھہرو ابھی آگے نہیں جانا۔ یہ جو میرے ساتھ خاتون کھڑی باتیں کر رہی تھیں یہ میری بیوی ہیں۔ یہ صفیہ ہیں۔ ان کو اس سے بہت صدمہ پہنچا کہ یا رسول اللہ ہم آپؐ پر بدظنی کر سکتے ہیں اور پھر وہ بھی مسجد میں اعتکاف کی حالت میں، تو آپؐ نے یہ کیوں فرمایا۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ شیطان انسان کی رگوں میں خون میں دوڑ رہا ہے۔ اس لئے تمہاری خاطر کہ کہیں خدانخواستہ تمہیں کوئی ٹھوکر نہ لگ جائے۔ اس لئے میں نے تمہیں بتا دیا کہ یہ کون ہے۔

یہ آنحضرت ﷺ کا اعتکاف تھا۔ اعتکاف میں عبادت میں بہت شدت اختیار کرتے تھے اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ کتنا سوتے تھے کتنا نہیں۔ مگر روایات سے یہ پتا چلتا ہے کہ عام عبادات کے مقابل پر رمضان کی عبادت بہت زیادہ ہوتی تھی اور رمضان کے عام دنوں کی عبادت کے مقابل پر آخری عشرے کی عبادت بہت ہوا کرتی تھی۔ یہ دستور آنحضرت ﷺ کا اسی طرح جاری رہا یہاں تک کہ آخری سال، جس سال آپؐ کا وصال ہوا ہے، اس سال کے رمضان مبارک میں آپؐ نے پھر بیس دن کا اعتکاف کیا ہے۔ کوئی ایسی بات آپؐ کو معلوم ہوئی ہے جس کے نتیجے میں عام سنت سے ہٹ کر پھر پہلی سنت کی طرف واپس گئے ہیں اور دس دن کی بجائے بیس دن کا اعتکاف کیا۔ یہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے کہ آخری سال بھی بیس دن کا ہی اعتکاف تھا اور پھر آپؐ کا وصال ہوا ہے۔ (بخاری کتاب الاعتکاف حدیث: 1903) کچھ ایسی باتیں ہیں جن کا ہمیں معین علم نہیں ہو سکا کیونکہ بعض وحی کے ذریعے پہنچنے والی ایسی اطلاعات ہوتی تھیں جن کو شاید صحابہؓ کو صدمے سے بچانے کے لئے آنحضورؐ کھل کر بیان نہیں فرماتے تھے۔ وصال کے متعلق بھی مجھے قطعی یقین ہے

کہ آپ ؐ کو پوری طرح مطلع فرما دیا گیا تھا۔لیکن آپ ؐ ان باتوں کو صحابہؓ سے چھپا لیتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ یہ جو بیس دن کا اعتکاف ہے اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا کہ کیوں کیا تھا۔مگر جب ہم ان دونوں باتوں کو جوڑ کر دیکھتے ہیں کہ پہلے دس دن کا ہوا کرتا تھا تو وہ بیچ کے عشرے سے آخری عشرے میں چلا گیا تھا اور وہ ایک اعتکاف بیس دن کا تھا۔تو وہ جوڑ جو پیدا ہوا تھا وہاں سے آغاز تھا زیادہ سے زیادہ اعتکاف کا۔اسی زیادہ سے زیادہ اعتکاف کی حالت میں آپ ؐ نے آخری رمضان گزارا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے رمضان کی کیفیت سے متعلق کچھ روایتیں آپ کے سامنے پیش کر رہا تھا۔وہ ملتا جلتا مضمون ہے جو مختلف روایتوں میں ملتا ہے میں پھر آپ کے سامنے اس کو رکھتا ہوں۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں۔یہ بخاری کی حدیث ہے کہ رسول کریم ﷺ سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور رمضان میں آپ ؐ کی سخاوت اور بھی زیادہ ہو جاتی تھی جب جبرائیل علیہ السلام آپ ؐ سے ملاقات کرتے تھے اور قرآن کا دور کرتے تھے رسول اکرم ﷺ ان دنوں تیز آندھیوں سے بھی زیادہ سخاوت فرماتے تھے۔(بخاری کتاب الصیام حدیث نمبر:1749)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:اِنَّ لِلصَّائِمِ عِنْدَ فِطْرِہٖ لَدَعْوَۃٌ مَا تُرَدُّ ۔کہ ہر انسان کے لئے روزہ افطار کرنے کے وقت ایک ایسی دعا کا وقت ہوتا ہے کہ وہ دعا رد نہیں کی جاتی۔افطار کے وقت عموماً خوش گپیوں میں لوگ مصروف ہو جاتے ہیں اور ایک طبعی بات ہے سارا دن پابندیوں کے بعد جب پابندی اٹھتی ہے وہ خوش ماحول میں گفت وشنید ہوتی ہے۔مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ایک ایسا وقت آ جاتا ہے جب اللہ تعالیٰ خصوصیت سے وہ دعا قبول کرتا ہے اس لئے اپنے اس وقت کو خوش گپیوں میں ضائع نہیں کرنا چاہئے۔بے تکلف گفتگو بے شک کریں لیکن دعا کو ہر وقت پیشِ نظر رکھیں اور دعا سے غافل نہ رہیں۔یہ جو دعا کا خاص وقت ہوا کرتا ہے اس کے پیچھے ہمیشہ حکمت ہوتی ہے۔سارا دن اللہ کی خاطر جب انسان روزہ رکھتا ہے اور تمام جائز چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے تو جب دوبارہ اللہ ہی کے نام پر انہیں شروع کرتا ہے تو جس طرح انسانی دل کی کیفیت ہوتی ہے ویسی مثال تو نہیں دی جاسکتی۔مگر اور چارہ نہیں ہے انسانی جذبات اور کیفیت کا حوالہ دیئے بغیر ہم ایک دوسرے کو بات سمجھا نہیں سکتے۔تو جس طرح کوئی انسان کسی کی خاطر کوئی کارنامہ سرانجام دے کر واپس آتا ہے تو اس کی پیٹھ پر پھر وہ تھپکی دیتا ہے اور خوشی کے کلمات

اس سے کہتا ہے اپنی خوشنودی کا اظہار کرتا ہے ایک طبعی امر ہے۔ تو اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں سے ایسا ہی سلوک فرماتا ہے اور اس حدیث میں اسی طرف اشارہ ہے کہ سارے دن کے بعد روزہ کھولا ہے تو خدا تعالیٰ اس وقت خاص ''مانگ کیا مانگ'' کے جلوے میں ہوتا ہے۔ اور اس وقت کوئی دعا ایسی کرنی چاہئے جو انسان کی عاقبت کو درست کر دے، عاقبت سنوار دے۔ لیکن ایسا تبھی ہوتا ہے جب انسان اس امر مفوضہ، یعنی اس کام کو باحسن سرانجام دے، جو اس کے سپرد کیا گیا ہو۔ اگر کام احسن طریق پر کرنے کی بجائے اسے بگاڑ کر آیا ہو تو پھر اس سے یہ سلوک نہیں ہوا کرتا۔ پس یہ نہ خیال کریں کہ یہ کوئی میکانکی چیز ہے۔ خود بخود ہی ہر روزہ دار کو یہ موقع ملتا ہے کہ اس کی ایک دعا ضرور قبول ہوگی۔ ان روزے داروں کا ذکر ہے جو روزے کو اچھی طرح گزارتے ہیں اور ایسے انداز سے گزارتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پیار کی نظر ان پر پڑتی ہے۔ پھر جب وہ کام کو مکمل کر لیتے ہیں تو ان کی کوئی دعا ایسی ہے جسے خدا ضرور سن لیتا ہے۔ پس اس پہلو سے اپنے روزوں کو بھی سنوارنے کی کوشش کریں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ تو میرے لئے ہے میں ہی اس کی جزاء بن جاتا ہوں یعنی روزوں کے ذریعے وصال الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ یہ اس لئے ہے کیونکہ میرا بندہ میرے لئے روزے میں اپنی جائز خواہشات اور اپنے کھانے پینے کو بھی ترک کر دیتا ہے۔ فرمایا کہ روزہ گناہوں کے خلاف ایک ڈھال ہے اور روزے دار کے لئے دو خوشیاں مقدر ہیں ایک وہ خوشی جو اسے اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ خدا کے فضل سے اپنے روزوں کو مکمل کر لیتا ہے۔ یعنی ہر روز جب وہ روزہ مکمل کرتا ہے تو اسے خوشی میسر آتی ہے یہ خوشی اسے دنیا میں ملتی ہے اور ایک وہ خوشی ہے جو اسے آخرت میں ملے گی جب وہ اپنے رب سے اس حالت میں ملے گا کہ وہ اس سے راضی ہوگا۔ نیز آنحضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ روزہ دار کے منہ کی بُو خدا کو مشک کی بُو سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ (بخاری کتاب الصوم حدیث: 1771)

اس حدیث میں ''میں جزاء بن جاتا ہوں'' کا جو مضمون ہے وہ کھول کر سمجھایا گیا ہے کہ عام عبادات میں انسان جائز باتیں ترک نہیں کرتا۔ کوئی اور عبادت ایسی نہیں ہے جو وہ جائز چیزیں جو انسان کے لئے خدا تعالیٰ نے خود جائز قرار دے دی ہیں وہ خدا کی خاطر چھوڑ رہا ہو۔ ایک روزہ ایسی چیز ہے جس میں تمام حلال باتیں بھی منع ہو جاتی ہیں سوائے سانس لینے کے۔ کیونکہ یہ تو ایک ایسی چیز

ہے جس کے بغیر پھر زندگی نہیں چل سکتی۔ تو خدا کے قریب ترین آنے والی عبادت روزہ ہے جو خدا سے مماثلت میں سب سے زیادہ قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ حی و قیوم ہے کسی غذا کا محتاج نہیں، کسی پانی کا محتاج نہیں اور روزمرہ زندگی میں انسان ان چیزوں کا محتاج رہتا ہے۔ عبادتیں پھر بھی ساتھ جاری رہتی ہیں۔ رمضان مبارک میں اور روزوں میں انسان خدا کی خاطر خدا کی مشابہت میں قریب تر آ جاتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اس کی جزاء بن جاتا ہوں۔ یعنی اس نے زیادہ سے زیادہ میرے قرب کی کوشش کی ہے۔ عبادت کا جو لفظ ہے (یہ دراصل عبادت اور عبودیت یہ دو الفاظ ہیں اسی طرح ایک عبدیت کا لفظ بھی ہے جس میں عبد کا مضمون پایا جاتا ہے)۔ عبد کہتے ہیں غلام کو۔ عبد کہتے ہیں اس شخص کو جس کا اپنا کچھ نہ رہا ہو اور انہی معنوں میں اللہ نے قرآن کریم میں انسانوں کے لئے عبد کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اس لئے کہ وہ پیدائشی غلام ہیں۔ ''گھر سے تو کچھ نہ لائے'' والا مضمون ہے۔ نہ اپنی بناوٹ میں ان کا کوئی عمل دخل، نہ اپنی بقا میں ایک ذرّے کا بھی ان کی کمائی کا کوئی دخل ہے۔ یہ تمام تر انسان کا وجود اللہ تعالیٰ کے احسانات کا مرہون ہے اور اسی کی تخلیق کے نتیجے میں انسان کو وجود کی خلعت بخشی جاتی ہے۔ تو وہ پیدا غلام ہوا ہے یہ یاد رکھنا چاہئے۔ اس کا اپنا کچھ نہیں کیونکہ غلام کی تعریف یہ ہے کہ جس کا اپنا کچھ نہ ہو اور پھر اسے عارضی طور پر ملکیتیں عطا ہوتی ہیں یہاں تک کہ پھر اس سے تقاضا کیا جاتا ہے کہ از خود اپنی ملکیتوں کو ترک کر کے خدا کے سپرد کرنا شروع کرو اور یہ عبادت ہے۔ عبادت کا اعلیٰ مقصد یہی ہے کہ انسان کو اس بات کی تربیت دے کہ خالی ہاتھ آیا تھا دنیا میں آ کر ہاتھ بھر گئے، بہت سی چیزیں مل گئیں، بہت سی چیزوں سے تعلقات قائم ہو گئے، اب از خود، جبراً نہیں، موت کے ذریعے نہیں بلکہ خود اپنے اوپر ایک موت طاری کر کے ان چیزوں کو خدا کے سپرد کرنا شروع کرو۔ ساری نہیں تو کچھ نہ کچھ کرو۔ لمبے عرصے تک نہیں تو کچھ عرصے کے لئے کرو یہاں تک کہ تمہارا ارادہ تمہاری عبدیت میں شامل ہو جائے اور اس کا نام عبادت ہے۔

عبودیت سے عبادت کا یہ فرق ہے کہ عبودیت میں تو بندے کے جتنے سلوک ہیں وہ سارے اس لفظ میں آ جاتے ہیں۔ عبادت بندے کے اس تعلق کو کہتے ہیں جو از خود اپنے شرح صدر کے ساتھ اپنی ملکیتوں کو خدا کی طرف لوٹا رہا ہے اور اپنے تعلقات کو اس کیلئے خاص کر رہا ہے دنیا سے تعلق کاٹتا ہے، اللہ کے سپرد ہو جاتا ہے، اپنی تمناؤں کا مرکز اس کو بنا لیتا ہے۔ تو ہر جگہ جو انتقال ہے ذہنی ہو یا عملی

ہو یہ دراصل خدا کی ہی چیز خدا کے سپرد کرنے والی بات ہے۔ یہ حالت جب ترقی کرتی ہے تو اس کو مزید مدد دینے کیلئے روزہ جگہ جگہ اس کے سہارے کے لئے آ کے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں اپنے تمام وجود کو اس طرح خدا کے سپرد کر دینا کہ گویا موت کے قریب پہنچ جائے اور رمضان جب گرمیوں میں آتا ہے تو وہ واقعی موت کے قریب پہنچانے والی بات ہے۔ ہم نے خود بہت سخت رمضان ربوہ کے ابتدائی دنوں میں کاٹے ہیں۔ ایسے سخت رمضان تھے وہ کہ آپ یہاں بیٹھ کے تو اس کا تصور کر ہی نہیں سکتے۔ بعض دفعہ ایک ایک ہفتے تک ایک سو بیس درجے سے اوپر درجہ حرارت رہتا تھا۔ ایک دفعہ مجھے یاد ہے 124 درجہ حرارت تقریباً دن رات رہتا تھا کیونکہ دن کو دھوپ پڑتی تھی اور رات کو پہاڑیاں ریڈی ایشن (Radiation) کرتی تھیں اور دن کی جذب کی ہوئی گرمی وہ سورج کی قائم مقامی میں واپس چھوڑ رہی ہوتی تھیں اور ہم ٹمپریچر دیکھتے تھے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا تھا نہ دن کو نہ رات کو حالانکہ عرب میں بہت گرمی ہوتی ہے لیکن رات بہت ٹھنڈی ہو جاتی ہے اس لئے کچھ Relief مل جاتا ہے۔ تو روزہ اس طرح کھولتے تھے کہ نیم مردہ کی حالت ہوتی تھی اور بعض لوگ چادریں بھگو بھگو کر اوپر لیتے تھے، پنکھے بھی نہیں تھے، بڑی سخت گرمیاں تھیں۔ بجلی کوئی نہیں تھی، مکان تھوڑے تھے اور مٹی بہت اڑتی تھی۔ عجیب قسم کی بلائیں تھیں جو گھیرے ہوئے تھیں۔ لیکن اللہ نے اس زمانے میں بھی بچوں کو اور بڑوں کو خوب توفیق دی اور اپنے فضل سے ان بداثرات سے بھی بچا لیا۔

رمضان خدا کی خاطر ایسی سختیوں کا نام ہے کہ جو بعض دفعہ موت کے منہ تک پہنچا دیتی ہیں اور اس کے نتیجے میں اللہ کہتا ہے کہ میں جزا ہوں۔ اور فرمایا ہے کہ مجھے ایسے شخص کے منہ کی بدبو بھی جو رمضان میں میری خاطر اس نے قبول کر لی ہے، یہ کستوری کی خوشبو سے بہتر لگتی ہے۔ یہ مراد تو نہیں ہے کہ کستوری کی خوشبو اللہ تعالیٰ سونگھتا ہے لیکن خالق کو اس چیز کی صفات کا علم ہوتا ہے۔ جب تک ایک خالق کو اس چیز کی صفات کا علم نہ ہو وہ چیز بنا ہی نہیں سکتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ کہنا بے ہودہ بات ہے کہ وہ سونگھ سکتا ہے کہ نہیں۔ جو چیز اس نے پیدا کی ہے اس کے تمام خواص سے وہ واقف ہے ورنہ اس کی تخلیق کے ڈیزائن میں وہ خواص آ ہی نہیں سکتے۔ پس یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ بدبو کیا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ خوشبو کیا ہوتی ہے اور اس موقع پر وہ خوشبو پر بُو کو ترجیح دے رہا ہے۔ لیکن اس سے مومن عموماً یہ تو خوش ہو جاتے ہیں کہ ہمارے رمضان کی منہ کی بُو اچھی بات

ہے، کوئی حرج نہیں۔ لیکن یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ رمضان کے بعد بھی تمہارے منہ کی بدبو پسند ہے اور آنحضرت ﷺ کی سیرت جو سارا سال جاری رہتی تھی اس طرف توجہ نہیں کرتے۔ اس کا مطلب ہے کہ خدا تعالیٰ کے پاک بندے اپنے منہ کو ہمیشہ صاف ستھرا رکھتے ہیں اور سوائے رمضان کی مجبوری کے ان کے منہ سے بُو نہیں آتی۔ یہ پہلو بھی تو دیکھیں۔ اس لئے رمضان میں تو مجبوری ہے رمضان کے بعد خوب مسواک کیا کریں اور اپنے منہ کو ہمیشہ پاک صاف رکھیں، منجن استعمال کریں، کلیاں باقاعدہ وضو کے ساتھ تو کرتے ہیں کھانے کے بعد بھی کیا کریں۔ اس سے آپ کے دانت وغیرہ بھی ٹھیک رہیں گے اور پھر رمضان میں جب داخل ہوں گے پھر آپ کے منہ کی بُو وہ بُو بنے گی جسے اللہ تعالیٰ پسند فرمائے گا۔ ورنہ رمضان سے باہر بھی وہی بُو تھی تو پھر خدا کو یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ مجھے تمہارے منہ کی بُو کستوری سے بہتر لگتی ہے۔ کیونکہ وہ بُو تو پھر تمہارے اپنے مزاج کی بُو ہے خدا تعالیٰ کی خاطر نہیں ہے۔

میں نے یہ پہلے بیان کیا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے رمضان میں دنیا کے ابتلاؤں سے بچنے کو قربانی قرار دیا ہے۔ چنانچہ آنحضور ﷺ فرماتے ہیں کہ روزے دار جب دنیا سے کٹ کر مسجد کا ہو رہتا ہے تو میں اسے خوشخبری دیتا ہوں کہ وہ مسجد سے باہر جو نیک کام کیا کرتا تھا ان سے محرومی کا اس کو کوئی صدمہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وہ تمام نیک کام اس کے نہ کرنے کے باوجود اس کے کھاتے میں لکھ دیئے ہیں۔ تو نیکی اصل وہی ہے جو آزمائشوں میں پڑ کر دنیا کے ساتھ تعلقات کے دوران ظاہر ہو رہی ہے اور اعتکاف اس نیکی کو ترقی دینے کی بات نہیں ہے اس نیکی سے عارضی طور پر خدا کے لئے ایک اور نیکی کی خاطر محروم ہونے کا نام ہے۔ لیکن روزمرہ کی مومن کی زندگی وہی ہے جو تمام دنیا کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے گزرے اور اس کے ساتھ ساتھ خدا کے عائد کردہ فرائض کے تقاضے بھی پوری طرح شان کے ساتھ پورے ہوں۔ یہ ہے وہ صراطِ مستقیم جس کے لئے ہم روزانہ دعا کرتے ہیں۔

مسلم کتاب الصیام باب فضل الصیام میں یہ روایت ہے کہ حضرت سہلؓ بن سعد بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں ایک دروازہ ہے جس کو ''ریّان'' یعنی سیرابی کا دروازہ کہتے ہیں۔ اس دروازے میں سے قیامت کے دن صرف اور صرف روزہ دار جنت میں داخل

ہوں گے اور ان کے علاوہ ان کے ساتھ اس دروازے میں کوئی داخل نہیں ہوگا۔ اس دن یہ منادی کی جائے گی کہ روزہ دار کہاں ہیں؟ پھر ان کو بلا بلا کر اس دروازے کے ذریعے سے جنت میں داخل کیا جائے گا اور جب آخری روزہ دار اس دروازے میں سے داخل ہو جائے گا تو اس دروازے کو بند کر دیا جائے گا اور کوئی غیر اس میں سے جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔'' (مسلم کتاب الصیام حدیث: 1947)

یہ حدیث ایک ظاہری منظر کھینچ رہی ہے پچھلے سال بھی غالباً میں نے اس کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی تھی۔ اس ظاہری منظر کو کلیۃً ظاہر پر محمول کرنا نہ تو اس حدیث کا منطوق ہے نہ اس سے آپ فائدہ اٹھا سکیں گے اور نہ جنت کا کوئی صحیح تصور آپ کے ذہن میں ابھرے گا کہ جنت کیا ہوتی ہے۔ اگر وہاں گیٹ لگے ہوں اور کہا جائے کہ اس دروازے سے آجاؤ تو اس سے مستقلاً کسی کو کیا فائدہ! اور ایک آدمی نمازی بھی ہے نماز کے دروازے سے بھی اس کو بلایا جائے گا اور نیکیاں بھی کرتا ہے جنت کے سات نیکیوں کے دروازے ہیں وہ باری باری ایک سے نکل کر دوسرے میں جائے، پھر اس سے نکل کر تیسرے میں جائے۔ کیا یہ منظر ہے جو جنت کے تعلق میں انسان اپنے تصور میں قائم کر سکتا ہے؟ بالکل درست نہیں۔ یہاں اس کی مثال حواس خمسہ سے دی جا سکتی ہے۔ ایک انسان جسے دیکھنے کی حس عطا ہوئی ہو وہ دنیا کے اکثر تجارب میں اس حس کے دروازے سے دنیا میں داخل ہوتا ہے اور دیکھنے سے تعلق کی ساری لذتیں اس کو نصیب ہوتی ہیں اور اس کے لئے باری باری کی بحث نہیں ہے کہ اب وہ آنکھوں کے رستے داخل ہو۔ پھر وہ کانوں کے رستے داخل ہو بلکہ کانوں کا بھی ایک دروازہ دنیا میں قائم ہوا ہے اور کانوں کے رستے بھی وہ دنیا میں داخل ہوتا ہے اور سماعت سے تعلق رکھنے والی لذتیں حاصل کرتا ہے۔ تو پانچ مختلف جو حصے ہیں وہ گویا کہ اس کے لئے دنیا میں داخل ہونے کے دروازے ہیں ایک دروازہ بند ہو جائے تو اس مضمون کی دنیا اس کے لئے کالعدم ہو جاتی ہے۔ اس کے تعلقات کے دائرے سے باہر نکل جاتی ہے۔ اسی دنیا میں رہتا ہے مگر کم لطف اٹھاتا ہے۔ ایک اندھا، دیکھنے والے کی نسبت کم لطف اٹھاتا ہے۔ ایک نہ سننے والا، سننے والے کی نسبت کم لطف اٹھاتا ہے۔ ایک منہ کی لذت سے محروم انسان یا اس کے بعض پہلوؤں سے محروم انسان اسی طرح کھانے میں کم لطف اٹھاتا ہے۔ بعض بے چاروں کی خوشبو کی طاقت مر جاتی ہے۔ ان کو کیا پتا کہ پھولوں کی مہک کیا ہوتی ہے۔ وہ پہلو ان کی لذتوں کا ان کے ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ تو مراد یہ ہے کہ بے روزے بھی جنت

میں داخل ہو جائیں گے۔ یعنی یہ تو نہیں کہ جن کو روزے کی توفیق نہیں ملی وہ داخل ہی نہیں ہوں گے۔ مگر یہاں خدا کی خاطر سیرابی سے محرومی کا جو وہ تجربہ کر چکے ہیں اس کے نتیجے میں انہیں ایک خاص حس عطا ہوتی ہے جو آئندہ جنت میں ان کو غیر معمولی طور پر جنت کی نعمتوں سے سیراب ہونے کا سلیقہ اور قوت عطا کرے گی۔

پس یہ وہ دروازے ہیں جن کا حدیثوں میں ذکر ملتا ہے ورنہ ظاہری طور پر کسی دروازے سے جنت میں چلے جانا وہ آج چلا گیا کل بھول گیا۔ ہمیشہ ہمیش کے لئے جنت میں رہنا ہے۔ تو دروازے کس کو یاد رہیں گے لیکن جو مضمون میں بتا رہا ہوں جو روزمرہ کی زندگی میں ہمارا تجربہ شدہ مضمون ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ جو شخص بینائی کے دروازے سے دنیا میں داخل ہوتا ہے اس کی موجیں ہی اور ہیں بہ نسبت اس بے چارے کے جو اس دروازے سے داخل نہیں ہوتا۔ پس اسی جنت میں جس میں اور بھی لوگ رہ رہے ہوں گے روزے دار کی لذتیں اور ہوں گی اور جو سیرابی کا لطف ہے وہ ایک غیر معمولی لطف اس کو نصیب رہے گا۔ پھر فرمایا وہ دروازہ بند ہو جائے گا اس کے بعد دوسروں کے لئے پھر وہ نہیں کھلے گا۔

بخاری کتاب الصیام میں حضرت انسؓ بن مالک کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''مسلمانو! سحری کھایا کرو کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہے۔'' (بخاری کتاب الصوم حدیث: 1785)

یہ سحری کھانے میں برکت کا جو مضمون ہے وہ یہ ہے کہ بعض لوگ زیادہ نیکی اختیار کرنے کی خاطر اس زمانے میں آٹھ پہرے روزے رکھا کرتے تھے اور یہ ظاہر کرتے تھے کہ خدا کی خاطر بھوک کو زیادہ برداشت کرنا یہ دراصل نیکی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے سامنے جب بھی ایسے لوگ آئے آپؐ نے اس کی اصلاح فرمائی اور سمجھایا کہ نیکی خدا کو زبردستی خوش کرنے میں نہیں ہے کیونکہ کوئی دنیا میں خدا کو زبردستی خوش نہیں کر سکتا۔ جتنی تمہاری طاقت ہے تم اپنے اوپر جتنی چاہو تنگیاں ڈال لو اس کے ذریعے سے خدا کو خوش نہیں کر سکتے۔ خدا کو خوش کرنا اس کی رضا میں ہے۔ پس جب خدا نے تمہارے لئے سحری کا کھانا خود مقرر فرما دیا ہے تو اس سے ہاتھ کھینچ لینا اور اسے نیکی سمجھنا جائز نہیں۔ پس سحری میں برکت ہے، اٹھا کرو اور اس خیال سے کھایا کرو کہ اللہ نے تم پر رحم فرماتے ہوئے چوبیس گھنٹے کا روزہ نہیں رکھوایا بلکہ نصف دن یا کم و بیش جو بھی شکل ہو کا روزہ رکھوایا ہے۔ تو اس لئے سحری ضرور کھانی

چاہئے اور اگر اس خیال سے کھائیں گے تو پھر اس میں زیادہ لطف محسوس ہوگا۔

ترمذی ابواب الصوم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ تمہارا رب فرماتا ہے کہ ہر نیکی کا ثواب دس گُنا سے لے کر سات سو گنا تک ہے اور روزے کی عبادت تو خاص میرے لئے ہے۔ میں خود اس کی جزا ہوں یا جزا دوں گا۔ (دونوں الفاظ ملتے ہیں۔) روزہ آگ سے بچانے کے لئے ڈھال ہے اور روزے دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک کستوری کی خوشبو سے بھی زیادہ محبوب ہے۔

جہاں تک یہ ''گُنا'' کی بحث ہے قرآن کریم میں جب زیادہ گنا، اتنے گنا کی بات چلتی ہے جیسا کہ فرمایا کہ وہ بیج جو پھوٹے اور اس پہ ایک دانے میں سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں تو وہ سات سو گُنا کی بات ہے۔ یہ حدیث اسی طرف اشارہ کر رہی ہے مگر ساتھ ہی اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ جس کے لئے چاہے وہ اس سے بھی بڑھا دیتا ہے۔ پس جو سات سو گنا کا مضمون ہے یا اس سے دس گنا کا، جو بھی شکل ہو اس سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ گن گن کر بعینہٖ اتنے گنا ثواب ملتا ہے اور بات ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ذرا تحریص کے لئے اس قسم کے نقشے کھینچے گئے ہیں تا کہ لوگوں کو خوشی پیدا ہو، دل میں شوق پیدا ہو۔ ایسی نیکیوں کو اختیار کرے کہ تھوڑے عمل کے نتیجے میں زیادہ جزا مل جائے۔ مگر دراصل جزاء لامحدود ہے اور اسی مضمون کو قرآن ہی سے لیا گیا ہے۔ لامحدود کا آخری کنارہ خدا ہے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ سات سو سے بڑھا کر بھی دیا جا سکتا ہے۔ فرمایا کہ اتنا بڑھایا جا سکتا ہے کہ خدا خود جزا بن جائے۔ اگر خدا خود جزا بن جائے تو اسے آپ کتنے گُنوں میں شمار کریں گے۔ لاکھ گنا کروڑ گنا دس ارب گنا اس سے بھی زیادہ جتنا تصور کر لیں وہ گنتی میں نہیں آ سکتا۔ تو قرآن کریم ہی میں آنحضرت ﷺ کی احادیث کی بنیادیں ہیں۔ وہ تمام احادیث جو حضرت اقدس محمد رسول اللہ ﷺ سے وابستہ ہیں، اگر آپ فراست سے کام لیں اور ان کو قرآن میں تلاش کریں تو ایک بھی حدیث ایسی نہیں ملے گی جس کی قرآن میں جڑیں نہ ہوں اور وہیں انہی آیات سے یہ مضمون آنحضور ﷺ نے اٹھائے ہیں۔ پس اس پہلو سے سب سے زیادہ پاک تفسیر قرآن کی محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہے اور آپ کا کلام اس تفسیر پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔ اب آخر پر میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اقتباس آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں:

''اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو دوسری امتوں کی طرح اس امت میں کوئی قید نہ رکھتا مگر اس نے قیدیں بھلائی کے واسطے رکھی ہیں۔ میرے نزدیک اصل یہی ہے کہ جب انسان صدق اور کمال اخلاص سے باری تعالیٰ میں عرض کرتا ہے کہ اس مہینے میں مجھے محروم نہ رکھ تو خدا تعالیٰ اسے محروم نہیں رکھتا اور ایسی حالت میں اگر انسان ماہ رمضان میں بیمار ہو جائے تو یہ بیماری اس کے حق میں رحمت ہوتی ہے کیونکہ ہر ایک عمل کا مدار نیت پر ہے۔ مومن کو چاہئے کہ وہ اپنے وجود سے اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کی راہ میں دلاور ثابت کر دے۔ جو شخص کہ روزے سے محروم رہتا ہے مگر اس کے دل میں یہ نیت درد دل سے تھی کہ کاش میں تندرست ہوتا اور روزہ رکھتا اور اس کا دل اس بات کے لئے گریاں ہے تو فرشتے اس کے لئے روزے رکھیں گے بشرطیکہ وہ بہانہ جُو نہ ہو۔'' (ملفوظات جلد 2 صفحہ 563)

پس رمضان تو اب ہاتھ سے نکلا چلا جاتا ہے بہت سے ایسے ہمارے بیمار اور کمزور جو کسی مجبوری کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکے ان کی تسلی کے لئے میں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ اقتباس آپ کے سامنے رکھا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں کہ ایسے لوگ غم نہ کریں اگر بیماری سے پہلے کی حالت میں انہیں روزے کی تمنا تھی تو ان کی بیماری کے روزے بھی ان کے حق میں لکھے جائیں گے اور اگر پہلے تمنا نہیں تھی تو بیماری کے روزے نہ رکھنے کی اجازت سے بھی وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یہ مضمون ہے جسے میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ رمضان کے تعلق میں ہمیں اصل میں زندگی کا فلسفہ مل گیا ہے۔ اس دنیا میں جو لوگ نیکی کی تمنا رکھتے ہیں اور نیکی کرنے کی کوشش کرتے ہیں موت ان کے سفر کو ختم کر دیتی ہے مگر خدا کے نزدیک وہ نیکیاں جاری رہتی ہیں۔ اسی لئے لامتناہی جزا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ روزے کی تمنا لے کر اور حسب توفیق روزے رکھتے ہوئے اگر بیماری پڑ گئی تو تمہارا عمل منقطع نہیں ہوگا خدا کے حضور لکھا جائے گا اور جزا بھی لامتناہی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ اس رمضان کی جزا تمام دنیا کے احمدیوں کے لئے اور بنی نوع انسان کے لئے، ان کے فیض سے لامتناہی کر دے۔ خدا کرے کہ جو دن کوتاہی میں کٹ گئے ان کا نقصان ہمیں نہ

پہنچے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عفو کا ہاتھ ان کوتاہیوں کو مٹا دے اور ہماری نیکیوں کو اجاگر کر دے اور ہمیشہ کے لئے زندہ رکھے اور آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی ان کا فیض پہنچتا رہے۔ آمین۔